خلیفہ عبدالحکیم : ایک مفکر اسلام

محمد عثمان

کسی ادیب یا شاعر کے کام کو پرکھنے اور اس کی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لئے بعض اصول اور تنقیدی معیار ہماری مدد کرتے ہیں ۔ مثلاً کسی ناول نگار کے فن کا جائزہ لیتے وقت ہم اس کے ناولوں کے موضوع ، اس کی کردار نگاری ، اس کی قصہ سازی، اس کی قوت مشاہدہ اور اسلوب بیان وغیرہ کو پرکھتے ہیں اور اس سے ہمیں بآسانی پتہ چل جاتا ہے کہ زیر بحث ناول نگار کس درجے اور کس حیثیت کا ادیب ہے اور اس نے ناول کی دنیا کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے ۔ یہی بات شاعر ، ڈرامہ نگار ، مصور ، سنگ تراش یا کسی بھی فنکار کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ۔ ڈرامہ نگاری کو پرکھنے کے واضح اصول موجود ہیں ۔ شاعری اور مصوری کی جانچ پرکھ کے اپنے قاعدے اور ضابطے مروج ہیں ۔ ان ضابطوں اور قاعدوں کی اپنی اپنی تاریخ ہے ۔ کون قاعدہ یا تنقیدی معیار کب رائج ہوا ؟ کس نے ابتدا کی ؟ کس کس نے اتفاق یا اختلاف کیا ؟ ہر فن کی تاریخ سے ان سوالوں کے جواب ملتے ہیں۔ یہی صورت فلسفہ ، سائنس اور دوسرے علوم میں نظر آتی ہے ۔ اگر آپ کسی فلسفی یا عالم کا مقام اس کے خاص علم کے دائرے میں متعین کرنا چاہیں تو اس کے تنقیدی اصول اور ضابطے آپ کی رہنمائی اور مدد کو حاضر ہوتے ہیں ۔

کیا یہ بات ان لوگوں کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے جو عام معنوں میں فلسفی، مفکر یا عالم نہ ہوں بلکہ اسلامی فکر کے علمبردار اور اس کی تاریخ کے معمار ہوں ؟ اس سوال کا جواب نہ واضح طور پر نفی میں ہے اور نہ اثبات میں ۔ نفی میں یوں نہیں کہ کم وبیش تیرہ سو سال سے ہمارے آبا و اجداد اپنے علماء و آئمہ کے متعلق لکھتے لکھاتے آئے ہیں ۔ اور اثبات میں اس وجہ سے نہیں کہ یہ لکھنا لکھانا بیشتر دو لفظی رائے زنی یا اس قسم کے تعریفی یا تنقیصی جملوں پر مشتمل ہوتا تھا جیسے اردو کے قدیم تذکرہ نویس اردو شاعروں کے متعلق اپنی تالیفات میں درج کیا کرتے تھے ۔ مثلاً '' فلاں نوجوان عمدہ شعر کہتا ہے ۔ اس کے اشعار میں زبان کا حسن بھی ہے اور تخیل کی بلندی بھی'' یامثلاً ''فلاں شاعر بڑا ہونہار ہے۔ اس کا مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے'' یا پھر ''فلاں کے کلام کا رنگ استادانہ ہے'' وغیرہ وغیرہ ۔ ہمارے قدیم مذہبی علمی سرمائے میں علما اور آئمہ کے متعلق اسی قسم کی تنقید ملتی ہے : '' فلاں نہایت بلند پایہ عالم دین اور انتہا درجے کے پابند شرع بزرگ

تھے ''۔ '' فلاں کا مرتبہ علم اور تقویٰ دونوں میں فلاں بزرگ کے برابر اور فلاں سے ذرا کمتر ہے ''۔

مقصود اس سے سوء ادب نہیں ۔ فقط یہ کہنا مطلوب ہے کہ ہمارے اسلامی فکر کی تاریخ میں علماء و ائمہ کے مقام و مرتبے کا تعین کسی ایسے معیار سے نہیں ہوتا رہا جس کی تفصیلات اور جزئیات باقاعدہ طور پر علمی اور سائینسی انداز سے طے پائی ہوں۔ ہماری تنقید زیادہ تر تاثراتی اور ذاتی نوعیت کی حامل تھی ۔ البتہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں مصر ، ترکی ، لبنان ، شام ، ایران اور خود بر صغیر پاک و ہند میں جب مشرقی اور جدید مغربی علوم کے دھارے باہم ملنے لگے اور آویزش کی نئی صورتیں رونما ہوئیں تو عرب دنیا میں مفتی عبدہ اور علامہ رشید رضا اور ہمارے ہاں سرسید ، شبلی اور ابوالکلام آزاد کے ہاتھوں ایک نئی طرز تنقید نے جنم لیا اور ہم نے اپنے تمام دینی اور علمی سرمائے کا پھر سے اور جدید انداز سے جائزہ لینے کا کام شروع کیا ۔ تاہم جہاں تک علماء و مفکرین اسلام کے انفرادی مقام و مرتبہ کے تعین کا تعلق ہے ، یہ میدان باضابطہ معیار کے وضع و ترویج سے، میرے علم کی حد تک، تاحال خالی ہے ۔

یہاں ایک ذاتی تجربے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ چند سال ادھر کی بات ہے کہ دوران مطالعہ مجھے ایک موضوع تحقیق سے خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ موضوع یہ تھا کہ سرسید سے لے کر اب تک پاک و ہند میں اسلامی فکر کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کی ترقی میں یا اس کا رخ بدلنے یا سمت مقرر کرنے میں ہمارے جدید علماء مثلاً سرسید ، شبلی ، ابو الکلام آزاد ، مشرقی ، عبید اللہ سندھی ، اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبد الحکیم وغیرھم میں سے بھلا کس کس کا کتنا اور کیا حصہ ہے ۔ اس راہ تحقیق میں دوسری کئی دقتوں کے علاوہ ایک بڑی دقت یہ تھی کہ کسی مفکر اسلام یا متکلم اسلام کی حیثیت اور اسلامی فکر کی ترقی میں اس کے حصے (Contribution) کا فیصلہ کس پیمانے اور معیار کی رو سے کیا جائے ۔ میں نے بہتیرا ادھر ادھر جھانکا تاکا مگر اس قسم کا معیار ، برا یا بھلا ، مجھے کہیں نہ ملا ۔ بالآخر میں نے اس دقت کو اپنے طور پر حل کرنے کی سعی کی اور ایک معیار میری سمجھ میں آیا ۔ یقین غالب ہے کہ بعض حضرات اس معیار کو درست اور تسلی بخش قرار نہیں دیں گے ۔ اور خود مجھے اس کی درستی اور حتمی صحت کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں ۔ لیکن ایک بات اس کے متعلق ضرور کہوں گا ۔ وہ یہ کہ اس معیار کے پیش نظر میرے کام کی بہت سی مشکلیں آسان اور بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں جس سے میں نے یہ جانا کہ یہ معیار قابل اعتماد اور کار آمد ضرور ہے ۔ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے میں وہ معیار بیان کرتا ہوں ۔

یوں تو اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بے اندازہ خوبیاں اور محاسن ہیں اور قرآن حکیم کے اندر حکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے ایسے ایسے گوشے ظاہر و مخفی موجود ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا ، ان سب کی حقیقت اور تہ کو پانا اور ان سب سے بہرہ اندوز اور فیض یاب ہونا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ۔ تاہم جہاں تک اسلام اور اسلامی تعلیمات کی تفہیم و افہام کا تعلق ہے ، میرے خیال میں چار خصوصیات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی مفکر اسلام کی حیثیت متعین کرنے کے لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس نے کس حد تک ان خصوصیات کو پایا اور اپنایا ہے اور کس حد تک اس کا دامن قلب و نظر ان کی دولت و ثروت سے خالی ہے ۔

میرے نزدیک اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت اس کی وسعت ہے ۔ دنیا کا کوئی مذہب ، کوئی فلسفہ ، کوئی نظام حیات اپنی ہیئت ترکیبی میں اس قدر وسعت نہیں رکھتا ۔ اسلام نے اپنے نظام عقائد ، نظام اخلاق اور نظام معاشرت کو ایسی وسیع انسانی بنیادوں پر استوار کیا ہے جو اس سے پہلے اور اس کے بعد شاید ہی کسی نظام حیات کو نصیب ہوا ہو ۔ اسلام نے نسل ، رنگ اور جغرافیائی قومیت کے امتیازات کو بڑی خوبی اور کامیابی سے مٹایا ۔ رسول اکرم نے ارشاد فرمایا : اب سے کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عرب پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فوقیت حاصل نہیں رہی۔ قرآن حکیم نے یہ اعلان کر کے کہ " ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" شرف انسانی کو مال و دولت ، اقتدار و حکومت اور حسب نسب کے بوجھوں سے آزاد کر دیا ۔ اس نے مسلمانوں پر لازمی قرار دیا کہ اپنے نبی کی طرح پہلے انبیاء پر بھی غیر مشروط ایمان لائیں ۔ یہی نہیں اس نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ کرۂ ارض کی تمام قوموں کی طرف ہادی اور رسول بھیجے گئے اور ان تک خدا کی طرف سے ہدایت پہنچائی گئی ۔ پھر اس نے ان تمام لوگوں کو جو ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں تمام اختلافات بھول کر نیکی اور بھلائی میں تعاون کے لئے پکارا اور اتحاد عمل کی دعوت دی ۔ اسلام نے اپنے خدا کو رب العالمین بتایا اور اس کی بخشش و رحمت کو کسی ایک قوم یا طبقے کے ساتھ محدود و مخصوص کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ قرآن نے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرنے کی تلقین کی اور معاہدہ کر کے توڑنے سے منع فرمایا خواہ اس سے مسلمانوں کو نقصان اور ان کے دشمنوں کو فائدہ ہی کیوں نہ پہنچتا ہو ۔

مذاہب کی تاریخ میں عقائد و اعمال سے بھی زیادہ نازک مسئلہ آخروی نجات اور حصول جنت کا رہا ہے ۔ اسلام نے نہ صرف اچھے یہودیوں اور اچھے نصرانیوں کی تعریف کی ہے اور ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کو سراہا ہے اور ان کو

برے یہودیوں اور برے نصرانیوں سے الگ کرکے دیکھا اور دکھایا ہے بلکہ جنت کی اجارہ داری کے تصور کی شدید مخالفت اور تردید کر کے اور خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا مدار خالص ایمان اور نیک عملی پر ٹھرا کر تاریخ انسانی میں پہلی بار نجات آخروی کے حصول اور سوال کو ہر قسم کی گروہ بندی سے مبرا قرار دیا ۔

انسان اتنے وسیع القلب اور فراخ نظر نہیں ہوتے جتنا کہ خدائی ہدایت کا راستہ (قرآن حکیم) ہے ۔ لہذا یہ لوگ اپنی تنگ نظری اور کم دلی کو قرآن میں دیکھنے یا یوں لکھیئے کہ قرآن کی وسعتوں کو اپنی حد نظر کے مطابق کاٹنے چھانٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔ قرآنی تعلیمات کی بعض وسعتیں تو ظاہر و باہر اور باسانی سمجھ میں آنے والی ہیں لیکن بعض بڑی نازک اور گریز پا بھی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان گنت مفکرین، متکلمین اور مبلغین اسلام ایسے گزرے ہیں اور آج بھی ہیں جو کمیٔ خلوص یا کوتاہی یا کاوش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنی خلقی مجبوریوں اور ذہنی معذوریوں کے سبب اسلام کی وسعت کو کبھی نہ دیکھ سکے ۔ اور جب دیکھ ہی نہ سکے تو اسے پیش کیونکر کرتے ، اس کی اشاعت کا بیڑا کیسے اٹھاتے ، اس کے علمبردار کیونکر ہوتے ۔

مختصر یہ کہ میں جب بھی کسی اسلامی مفکر یا دانشور کی حیثیت و مرتبہ پر غور کرتا ہوں تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس نے اسلام کی وسعتوں کو کس حد تک پایا ہے اور کہاں اس کا فہم و ادراک اسلام کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گیا ہے ۔ میں اس فاصلے کو ناپنا ، اس فصل و بُعد کا اندازہ کرنا اپنے معیار نقد کا پہلا جزو خیال کرتا ہوں ۔

اس معیار کا دوسرا جزو گہرائی ہے ۔ قرآن حکیم میں جہاں مادی اور طبعی حقائق و واقعات کا بیان ہے وہاں ان کے پہلو بہ پہلو ایسے حقائق و واقعات کا تذکرہ بھی ہے جو مادی اور طبعی دنیا سے ماورا روح اور کائنات کے لطیف تر اور عمیق تر واردات و احوال سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس میں حضرت سلیمان کے دربار کے ایک ایسے ذی علم شخص کا ذکر بھی ہے جس نے پلک جھپکتے میں ملکہ سبا بلقیس کا تخت حضرت سلیمان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس میں غزوۂ بدر میں ملائکہ کے ذریعے مسلمانوں کی امداد غیبی کا حوالہ بھی ہے ۔ اس میں حضرت موسیٰ کے ہاتھوں پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹ بہنے اور دریائے نیل کے پانی کا دو حصوں میں بٹ جانے کا تذکرہ ہے ۔ اس میں واقعۂ معراج ، قصۂ اصحاب کہف اور حضرت عیسیٰ کی بن باپ کے پیدائش کا بیان بھی ہے۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ حضرت لوط اور حضرت مریم کے سامنے فرشتوں کا بہ شکل انسان ظاہر ہونا مذکور ہے اور اس صاحب نظر و عمل انسان کا تذکرہ بھی ہے جسے عرف عام میں خضر کہتے ہیں ۔

بےشمار مفسر قرآن اور متکلم اسلام ایسے گزرے ھیں اور اب بھی ھیں جن کی باتیں 'علم' اور شنید ھوتی ھیں، ان کے سب وعظ و ارشاد قال کے تنگ دائرے میں گھومتے ھیں ، ان کا دل لذت عشق و معرفت سے اور ان کی نظریں ذوق وصل و دید سے بے نصیب ھوتی ھیں۔ ھمارے زمانے میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ھیں جو اسلام کی تعلیم کے اس اھم پہلو سے اس قدر غافل اور اس دولت قلب و نظر سے اس حد تک محروم واقع ھوئے ھیں کہ قرآن کے آن سب مقامات و احکام کو جن کی غائت اصلی خدا کی ذات سے براہ راست تعلق پیدا کرنا، اس کی محبت سے بہرہ اندوز ھونا اور عقل کی سرحدوں سے پرے شوق و عرفان کی منزلوں میں داخل ھونا ھے ، خالص مادی اور معاشرتی معانی پہنا کر دم لیتے ھیں ۔

میں جب بھی کسی مفکر اسلام کے مقام پر غور کرتا ھوں تو دوسری بات اس کی تصنیفات میں یہ ڈھونڈتا اور تلاش کرتا ھوں کہ اسلام کی اتھاہ گہرائیوں کا بھی وہ شناور ھے کہ نہیں ، اس کی فطرت کو مذاق روحانی بھی نصیب ھوا ھے کہ نہیں ۔ وہ صرف معاشرت و اخلاق اور سیاست و اقتصاد ھی کی باتیں کرتا ھے یا صلواۃ و درود کا رمزشناس بھی ھے۔ وہ دن کی مصروفیتوں ھی کا قائل ھے یا رات کی ریاضت و عبادت اور ''ان ناشئة الیل ھی اشد و طا و اقوم قیلا .،، (۷۳، ۶) مقامات کی بھی کچھ خبر رکھتا ھے ۔

[بلاشبہ رات کو اٹھنا اور مصروف عبادت رھنا شخصیت کو پختہ اور دعا کو پر تاثیر بناتا ھے] ۔

اس معیار کا تیسرا جزو اسلام اور قرآنی تعلیمات کا بے مثل حسن توازن ھے ۔ دین و دنیا ، جسم و روح ، عبادت و معاشرت ، اخلاق و سیاست ، مرد اور عورت ، امیر اور غریب ، آقا و غلام — انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کے درمیان اعتدال اور توازن کی جو راہ ھم کو اسلام نے دکھائی ھے ان سب کو جاننا سمجھنا ، قبول کرنا اور اپنانا ، پیش کرنا اور دکھانا جتنا بظاھر عام اور آسان دکھائی دیتا ھے ، در حقیقت اتنا ھی کمیاب اور مشکل ھے ۔ اسلام نے بے شمار تفریقوں کو مٹایا اور ان گنت مساواتوں کو بڑے نازک توازن اور تناسب کے ساتھ قائم کرنے کی طرح ڈالی ھے ۔ ان امور کے علاوہ جن کو میں نے اوپر گنوا دیا ھے ، انسانی زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ھیں جن کو قرآن نے بیان کیا ھے یا پھر ان کے بارے میں دانستہ اور حکیمانہ سکوت اختیار فرمایا ھے تاکہ ھم قرآن کے بتائے ھوئے اصول توازن و اعتدال کی روشنی میں خود توازن اور عدل کے ساتھ فیصلے کریں اور قدم اٹھائیں ۔ لاتعداد امور و معاملات وقت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں پیدا ھوتے اور شدید ذھنی یا معاشرتی الجھنوں کا باعث بنتے ھیں اور جن کے مناسب حل کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا ۔ اسلامی مفکر اور دانشور وہ ھے جو ان معاملات میں

عدل‌وتوازن اور حق و انصاف کی وہ راہ اختیار کرے جو قرآن‌کی روح اور منشا کے کے عین مطابق ہو۔

میں جب بھی کسی بڑے عالم دین اور مفکر اسلام کی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو تیسرے نمبر پر یہ دیکھتا ہوں کہ اس کا علم اور اس کی نظر بے شمار جدید مسائل میں اس کو کس سمت لے جاتی ہے۔ کیا وہ اسلام کے نام پر زندگی کی ترقی اور بہاؤ میں جگہ جگہ بند باندھتا اور قدم قدم پر روڑے اٹکاتا ہے؟ کیا وہ جدید کی لذت اور تجدید کے شوق میں ہر حد کو پھلانگتا اور ہر سرحد سے تجاوز کرتا ہے؟ یا قرآن کے اصول توازن و اعتدال کو سمجھتے ہوئے اور اس کی روح پر نگاہ رکھتے ہوئے زندگی کی ترقی و تعمیر میں ہماری مدد کو پہنچتا اور منشائے الٰہی کی تکمیل کرتا ہے؟

میری نگاہ میں چوتھا معیار اقتضا بینی ہے۔ ہر ایسی تحریک، ایسی تہذیب، ایسے مذہب کے لئے جیسا کہ اسلام ہے یہ ایک قدرتی اور فطری امر ہے کہ ہر زمانے میں اس کی بقا اور ترقی کےلئے کچھ خاص تقاضے ہوں۔ جو تحریک دس پندرہ، بیس پچیس یا سو دو سو برس کی زندگی پر قانع اور مطمئن نہ ہو اور رہتی دنیا تک اپنے آپ کو زندہ و فعال اور ترقی یافتہ اور طاقتور دیکھنا چاہے اس کے لئے وقت کے عنصر کو جاننا سمجھنا اشد ضروری ہے۔ وقت مسلسل اور ہر لمحہ آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی اس رفتار اور مرور کےساتھ زندگی کے احوال میں تبدیلی اور تغیّر و تبدل واقع ہوتا ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ وقت کے ساتھ خود زندگی کی اصل، اس کی فطرت یا اس کی غائت بدل رہی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ زندگی کا ماحول، اس کے حالات مسلسل بدلتے آئے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ وقت کے اس کبھی نہ رکنے والے بہاؤ کے ساتھ زندگی کے جب احوال بدلتے ہیں تو ان پر قابو پانے اور ان کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل کو حل کرنے لئے ہر زندہ تحریک پر یہ لازم ہے کہ ان مسائل کے مطابق اپنے اندر سے وہ ہتھیار اور ساز و سامان پیدا کرے جو اس کے تفوق کے سلسلے کو ٹوٹنے نہ دے تا کہ تحریک مسائل و معاملات پر غالب رہے۔ اگر کسی زمانے میں مسائل‌ومعاملات خود تحریک پر غالب آگئے تو سمجھئے کہ تحریک خطرے میں ہےاور اس کی بقا مخدوش ہے۔ اس بیان کی توضیح و تصدیق کے لئے تاریخ فکر اسلامی سے بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ میں قریب ترین مثال سے کام لیتا ہوں۔

گذشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں برصغیر پاک و ہند میں وقت نے اسلام کے لئے ایک خاص صورت حالات پیدا کر دی تھی۔ اس بر صغیر میں شبلی جیسے درد مند عالم دین، ابو الکلام جیسے مفسر قرآن، حسین احمد مدنی جیسے شیخ الحدیث، محمد علی جوہر جیسے نڈر سیاسی قائد

45A

(۷۸۶)

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِهٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ
صَلُّوْا عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ

(سعدیؒ)

پہنچا بلندیوں پہ وُہ اپنے کمال سے
ناپید ظلمتیں ہُوئیں اُس کے جمال سے!
حُسنِ صفات ختم ہے اُس خُوش خِصال پر
صَلوٰۃ اُس کی ذات پر اور اُس کی آل پر!

(حکیمؔ)

اور عاشق اسلام موجود تھے لیکن وقت کا اقتضا پورے شعور اور پوری بصیرت کے ساتھ جس شخص کی سمجھ میں آیا اور جس نے اپنے زمانے میں اسلام کے لئے اقتضا بینی کا حق ادا کیا وہ صرف اقبال تھا ۔ اس نے اسلامی فکر کو تازہ کرنے ، مسلمانوں میں اسلام کی سچی اور گہری محبت پھر سے بیدار کرنے اور اسلام کی تعلیمات پر ان کے یقین و اعتماد کو بحال کرنے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ، پر ان کی کوئی خدمت اور ان کا کوئی کارنامہ ، ان کی اس خدمت اور ان کے اس کارنامے کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو انہوں نے وقت کے تقاضے کو پہچان کر اور بڑے بڑے نامور عالموں کو بے خبر یا گم کردہ راہ دیکھ کر اسلامی قومیت کی حقیقت کو اپنوں اور بیگانوں پر روشن کرنے کے سلسلہ میں انجام دیا ۔ اقبال سے پہلے اپنے اپنے دور کے تقاضے جن بزرگوں نے سمجھے اور دیکھے اور پھر تن من دھن سے ان کو پورا کرنے میں لگے رہے ، ان میں سرسید ، شاہ ولی اللہ ، مجدد الف ثانی ہند میں اور ابن تیمیہ ، غزالی ، رومی ، ابو حنیفہ اور احمد بن حنبل کے اسمائے گرامی پورے عالم اسلامی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔

چنانچہ چوتھی اور آخری اور سب سے اہم بات جو میں کسی مفکر اسلام کے ہاں دیکھتا بھالتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے زمانے کو اس نے کسی حد تک سمجھا اور دیکھا ہے ۔ اپنے عہد کے مخصوص اسلامی تقاضوں پر اسکی نظر کتنی اور کیسی ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس نے ، درمے ، سخنے قدمے ، کیا کچھ کیا ہے ۔

اس معیار کے مطابق میں خلیفہ عبدالحکیم کے کام کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یوں تو خلیفہ صاحب نے خاصی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ ان میں افکار غالب ، فکر اقبال ، حکمت رومی ، داستان دانش ، اسلام اینڈ کمیونزم اور ولیم جیمز کی مشہور تصنیف Varieties of Religious Experience کا ترجمہ شامل ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام پر لکھنے کا تعلق ہے ان کا اصل کارنامہ ''اسلام کا نظریۂ حیات'' ہے ۔ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ۔ اس کے علاوہ ''تشبیہات رومی'' اور ''اسلام کی بنیادی حقیقتیں'' (خلیفہ صاحب کا مضمون) بھی اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

''اسلام کا نظریۂ حیات'' کا بہ غور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ صاحب کو اسلامی تعلیمات کی وسعت کا صحیح اور سچا شعور حاصل تھا۔ انہوں نے ایک دو نہیں ، متعدد مقامات پر ان صداقتوں پر مناسب زور دیا ہے جس کے بغیر اسلام کے نظریۂ حیات کی تصویر مکمل نہیں ہوتی ۔ یہ واقعہ ہے کہ ہماری فکر کی پوری تاریخ میں اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کو پوری جرأت اور کامل یقین و اعتماد کے ساتھ بہت کم پیش کیا گیا ہے ۔ خلیفہ

عبدالحکیم ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کے اس حصہ' تعلیم کو شرح صدر کے ساتھ سمجھا اور الم نشرح پیش کیا۔ ان کی کتاب کا مقدمہ اور وہ باب جسکا عنوان ''مذہب کا اسلامی تصور'' ہے اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اسلام کے اندر وسیع انسانی ہمدردی اور انسان اور انسان کے درمیان ہرقسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر حق و انصاف قائم کرنے کی جو روح کار فرما ہے، خلیفہ صاحب اس کے محرم تھے۔

اب گہرائی کی طرف آئیے۔ ہمارے اس زمانے کے عام مذاق کے خلاف خلیفہ عبدالحکیم کا مذاق عارفانہ تھا۔ اور وہ اسلام کے سچے اور حقیقی تصوف سے آشنا تھے۔ وہ خود تو شاید صاحب حال بزرگ نہ تھے مگر ان کے مزاج اور ان کی شخصیت میں اس کا رنگ خاصا رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مولانا روم کی کرامت کو بھی دخل ہوگا۔ ظاہر ہے جو شخص رومی جیسے صاحب دل پر ایسی کتاب لکھے جو پوری علمی دنیا میں اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہو تو اس کا لکھنے والا خود اس دولت دل سے کیونکر محروم رہ جاتا جو رومی کے ہاں بے دریغ تقسیم ہوتی ہے۔ ''تشبیہات رومی'' سے بھی خلیفہ مرحوم کی شخصیت کے اس رخ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ جدید علوم و فنون کے ماہر اور ان کے بڑے قدردان تھے مگر طبعی اور مادی علوم کے مطالعہ اور شغف نے ان کے دل کو مردہ اور انکی روح کو بے ذوق نہیں کرڈالا تھا۔ ''اسلام کا نظریہ' حیات'' میں انہوں نے ''عبادت و اطاعت'' پر جو باب لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ پاکستان کا ہر نوجوان اسے بہ غور پڑھے اور وہ کالج کے درجوں میں انگریزی اور اردو کی نصابی کتب میں جگہ پائے۔ ان کی تحریروں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ وہ زندگی اور اسلام کی گہری اور روحانی حقیقتوں کے نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کے پرجوش مگر غیر ہنگامہ پرور علمبردار اور مبلغ بھی تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ اقبال نے عجمی تصوف کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور انہوں نے عمر بھر اسکے خلاف جہاد کیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود اقبال اپنے قلب و روح کے اعتبار سے اسلام کے سچے تصوف کی بڑی عمدہ مثال تھے۔ اقبال کے بعد ان کی اس بے نتیجہ اور حقیقتاً غیر اسلامی تصوف کے خلاف اٹھائی ہوئی تحریک کو بعض لوگوں نے ایسا رنگ دیا اور اس سے ایسا تاثر پیدا کیا جس سے روح اسلام بری طرح مجروح ہورہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ خدا کی سچی محبت، اسکی عبادت کا ذوق و شوق اور اسکی ذات اقدس سے ذاتی اور زندہ تعلق پیدا کرنے کی آرزو اور لگن کے لئے ان کے اسلام میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔

ایسے میں خلیفہ عبدالحکیم نے ''حکمت رومی''، ''تشبیہات رومی'' اور ''اسلام کا نظریہ' حیات'' کے ان ابواب کی صورت میں جن کا تعلق 'اسلامی خدا پرستی'

'صفات الہیٰ' 'صفات ذاتی' اور 'عبادت و اطاعت' سے ہے، جو خدمت انجام دی ہے ، اسکی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے ۔ ان کے سبب سے اسلام کے اصلی تصوف کی تاسیس ہوتی ہے ۔

اب توازن کے جزو کو لیجئے ۔ خلیفہ صاحب نے ہمارے جدید معاشرتی مسائل کے کئی موضوعات سے اپنی تحریروں میں بحث کی ہے ۔ انکی بحث میں ہر جگہ توازن اور اعتدال کا پہلو پایا جاتا ہے ۔ معاشرے میں عورت کے حقوق، جدید تہذیبوں کے صحت مند اور مفید عناصر کا اخذ و قبول، معاشرے میں مفلوک الحال طبقے کی دستگیری و اعانت، ان طبقوں پر قانونی پابندیوں کی سفارش جنکو نفع کاری کی کھلی چھٹی کے باعث ہمارا معاشرہ معاشرتی ناہمواری اور معاشی ناانصافیوں کا شکار ہے حتیٰ کہ یتیم پوتے کی وراثت، ضبط تولید اور خواتین کا سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا سوال — ان تمام امور میں خلیفہ صاحب نے جو موقف اختیار کیا وہ بہت سے دیگر مفکرین کے مقابلے میں روح اسلام کے زیادہ قریب ہے ۔

اب میں اقتضابینی کی طرف آتا ہوں۔ اسلام جیسی زندہ اور قید زمان سے آزاد تحریک کے لئے ہر زمانے میں کچھ مشکلات، کچھ مسائل خصوصیت کے ساتھ ایسے درپیش ہوتے ہیں جن کے مناسب حل پر اور جن کے بارے میں ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی پر اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے ۔ جو شخص اپنے معاصرین میں سے اسلام کی ضرورت کو پورا کرتا اور اسلام کی یہ بنیادی عصری خدمت سر انجام دیتا ہے وہی شخص، میرے نزدیک، اصلاً امام اور رہنما ہوتا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی کی صلاحیت کو میں اقتضابینی کہتا ہوں ۔

اقبال کی وفات کے بعد اب تک جو کم و بیش تیس برس کا زمانہ گزرا ہے اسمیں ہمارے حالات و احوال میں بڑی اہم اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ آزادی اور ایک آزاد وطن کا حصول بے پناہ فرق پیدا کرتا ہے ۔ اقبال اپنی بصیرت اور اسلامی فکر کی روشنی کے ساتھ ہمیں پاکستان کی سرحدوں تک چھوڑ گئے تھے ۔ سرحدوں کے اندر اور بعد کے مسائل کو ہمیں خود حل کرنا تھا۔ نئے حالات نے نہائت اہم اور سنگین مسائل پیدا کئے۔ اسلامی آئین کی تشکیل، ملک کے بے پناہ نئے پرانے وسائل کو اسلام کے اصول معاش کی روشنی میں بروئے کار لانا، ملک کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا، اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو اسلامی خطوط پر چلانا، یورپ اور امریکہ، روس اور چین کی تہذیبوں کی طرف مناسب رویہ اختیار کرنا، اپنی معاشرت کے جمود کو توڑنا، جدید علم و فنون اور صنعت و حرفت سے متوازن انداز میں استفادہ کرنا، اپنے نظام تعلیم کو نئی اور بنیادی ضرورتوں کے مطابق از سر نو تعمیر کرنا — یہ اور

اس قسم کے بیسیوں ایسے مسائل تھے جن میں پاکستان کی نئی مملکت اور عوام جن کے دل ہمیشہ اسلام کے ساتھ اور اسلام کی خاطر دھڑکتے ہیں، اسلامی اصولوں کی روشنی کے طلبگار اور آرزو مند تھے ۔

تھوڑے بہت زمانی فصل و بُعد کے ساتھ اس میدان میں تین اشخاص اترے : اول ابو الاعلیٰ مودودی، دوم، غلام احمد پرویز اور تیسرے خلیفہ عبدالحکیم۔ چند سالوں کے اندر اندر پوزیشن یوں ہوگئی تھی کہ ابو الا علیٰ مودودی اس مدرسہ فکر اسلامی کی قیادت کررہے تھے جو بدلے ہوئے حالات کو در خور اعتنا نہیں سمجھتا۔ غلام احمد پرویز اس مکتبہ خیال کو بڑھاوادے رہے تھے جو صرف بدلے ہوئے حالات ہی کو در خور اعتنا سمجھتا ہے اور خلیفہ عبدالحکیم اعتدال اور بصیرت اور اقتضابینی کی ان روایات کے علمبردار تھے جن کو اولاً سر سید نے قائم کیا اور درمیان میں اقبال نے نہایت بصیرت اور کامیابی کے ساتھ ترقی دی ۔

خلیفہ صاحب نے جس کام کو ہاتھ میں لیا تھا، اس کے لئے وہ پوری طرح مسلح تھے۔ جدید علوم سے واقف، قدیم علوم سے آگاہ ، اسلام کے محرم، مغرب کے رمز شناس، دماغ میں سوچنے کی صلاحیت، قلم میں لکھنے کی طاقت اور زبان میں فصاحت و بلاغت کا زور، پھر صحت بھی میسر اور فراغت بھی ۔ مگر افسوس کہ وہ اس کام کو پوری طرح سرانجام نہ دے سکے ۔

آج سر سید اور اقبال کے خوابوں کی سرزمین میں دوسرے مدرسہ ہائے فکر تو قوی، ذی اثر اور فعال ہیں مگر خود سر سید اور اقبال کا مدرسہ فکر کمزور اور کم اثر ہے ۔ اور اس وقت شاید ہماری سب سے بڑی علمی اور اسلامی ضرورت یہ ہے کہ اس کمزوری کو دور کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کام کی تکمیل کی جائے جسے خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں ۔